سرِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا — ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت — از ندیماں رازہا نتواں نہفت

حکمتِ اقبال

کلامِ اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی مفصل اور منظم تشریح

محمد رفیع الدین
ایم-اے، پی-ایچ-ڈی، ڈی-لٹ

حکمتِ اقبال پر ایک عمومی نظر

حکمتِ اقبال میں تصوّرِ خودی کا مقام

اقبال کے تمام حکیمانہ افکار کا سرچشمہ صرف ایک تصوّر ہے جسے اقبال نے خودی کا نام دیا ہے اقبال کے اور تمام تصوّرات اسی ایک تصوّر سے ماخوذ ہیں اور اس سے علمی اور عقلی طور پر وابستہ ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے تمام تصوّرات خود ایک دوسرے کے ساتھ بھی ایک علمی اور عقلی رشتہ میں منسلک ہیں اور اقبال کا فکر ایک ایسے نظامِ حکمت کی صورت میں ہے جس کا ہر تصوّر دوسرے تمام تصوّرات سے علمی اور عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا ہے جب تک ہم اس نظامِ حکمت کے مرکز یعنی تصوّرِ خودی کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھیں ہم اقبال کے کسی تصوّر کو بھی ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتے اور اس کے برعکس جب تک ہم اقبال کے ہر تصوّر کو جو اس کے نزدیک تصوّرِ خودی کے حاصلات یا مضمرات میں سے ہے پوری طرح نہ سمجھ لیں ہم خودی کے تصوّر کو پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتے اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے افکار کو الگ الگ کرکے اپنے غور و فکر کا موضوع نہ بنائیں بلکہ اس کے پورے فکر کا مطالعہ ایک کُل یا وحدت کی حیثیت سے کریں

ظاہر ہے کہ جب اقبال کا ہر تصوّر ایک پورے نظامِ فکر کا جزو ہے اور یہ پورا نظامِ فکر اس کی تشریح اور تفہیم کرتا ہے تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اُسے اس نظام کے جزو کی حیثیت سے ہی زیرِ غور لائیں۔ اگر ہم اس پورے نظامِ فکر سے الگ الگ کرکے یا اس کے کسی حصہ یا پہلو کو نظر انداز کرکے یا حذف کرکے یا غیر ضروری قرار دے کر اس پر غور کریں گے تو اس کے صحیح مفہوم پر حاوی نہ ہو سکیں گے۔ جب تک ہم اقبال کے کسی تصوّر کی ماہیت کو اس کے پورے نظامِ فکر کی روشنی میں اور اس کے باقی ماندہ تمام تصوّرات کی مدد سے معین نہ کریں وہ ہمارا اپنا پسندیدہ تصوّر ہو تو ہو اقبال

کا تصوّر نہیں ہوسکتا۔ اقبال کا تصوّر تو وہی ہوسکتا ہے جس کی ماہیّت اس کے پُورے نظامِ فکر نے معین کی ہو جب ہم ایک نظامِ حکمت کے کسی جزو کو اس سے الگ کر دیں تو وہ اسی طرح سے مُردہ ہو جاتا ہے جس طرح جسمِ حیوانی کا ایک عضو جب جسم سے کاٹ دیا جائے تو مُردہ ہوجاتا ہے۔ یہ اصُول فہم اقبال کے لیے ایک کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں یا اقبال پر لکھنے والوں میں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم پاکستانی ہوں یا غیر پاکستانی آج اقبال کے نظریات کے بارے میں جس قدر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جس قدر مباحثے یا اختلافات موجود ہیں جس قدر نظریات کو نادانستہ طور پر اپنے اپنے خیالات کی تائید میں استعمال کرنے کی غلط کوششیں کی جارہی ہیں اور اُن کے مفہوم کے اندر تضادات کے شبہات پیدا کیے جارہے ہیں ان سب کا باعث یہی ہے کہ انہوں نے اس اصُول کو مدّنظر نہیں رکھا۔

ایک ایسے فلسفہ کے اندر جس کے تمام تصورات صرف ایک ہی مرکزی یا بنیادی تصوّر سے ماخوذ ہوں حقیقی تضادات کا ہونا ناممکن ہے ایسی حالت میں تضاد پڑھنے والے کے ذہن میں تو ہوسکتا ہے لیکن فلسفی کے ذہن میں نہیں ہوسکتا۔ روضۂ تاج محل ایک خوبصورت کُل یا وحدت ہے جس میں کہیں کوئی تضاد موجود نہیں اور جس کی ہر اینٹ اس کی پوری وحدت کے ساتھ ہم آہنگ ہے لیکن فرض کیا کہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس کے بیسیوں ٹکڑے ہوجاتے ہیں جو دُور دُور بکھر جاتے ہیں اگر وہاں سے کوئی ایسا شخص گزرے جس نے روضۂ تاج محل کو ایک مربُوط اور منظم کُل کے طور پر کبھی نہ دیکھا ہو تو شاید وہ بعض ٹکڑوں کے باہمی ربط کو سمجھ جائے لیکن بہت سے ٹکڑے ایسے ہوں گے جن کو وہ بے معنی اور بے ربط سمجھنے پر مجبور ہوگا حالانکہ ان میں سے کوئی ٹکڑا بھی ایسا نہ ہوگا جو اس ٹوٹ پھوٹ جانے والی خوبصورت عمارت کے کسی نہ کسی کونہ میں اپنی جگہ نہ رکھتا ہو۔ اقبال کے فلسفہ کا حال بھی ایسا ہی ہے اس کے تمام تصوّرات اس کے اندر اپنا عقلی ربط اور ضبط رکھتے ہیں لیکن موجُودہ صُورت میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ ہم اقبال کے فلسفہ میں تضاد کا شبہ صرف اسی موقع پر کرسکتے ہیں جہاں ہم اس کے کسی تصوّر کو اس حد تک نہ سمجھ سکیں کہ ہمیں معلوم ہوجائے کہ اس کے بنیادی یا مرکزی تصوّر خودی کے ساتھ اُس کا عقلی اور علمی ربط کیا ہے اور لہٰذا اس کے پُورے فلسفہ میں اس کا مقام یا محل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اقبال کے اوسط درجہ کے مطالعہ کرنے والے کے پاس اقبال کا فلسفہ منظم صورت میں موجُود نہ ہوگا تو دَورانِ مطالعہ میں اس کے لیے بارہا اس قسم کے مواقع کا پیش آنا ضروری ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال کے فلسفہ کو منظم اور مربُوط

شکل میں پیش کرنا اقبال کی تشریح اور تفہیم کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

حکمت کی نوعیّت اور ضرورت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود فکر یا حکمت کی نوعیّت کیا ہے اور ہمیں اس کی ضرورت کیا ہے ؟ اور پھر اقبال کا فکر ایک نظامِ حکمت کی صورت میں کیوں ہے ؟ اقبال نے ایک ہی حقیقت پر اپنے افکار کی بنیاد کیوں رکھی ہے ؟ کیا اقبال کا یہ طرزِ عمل ضروری تھا یا محض اتفاقی ہے اور خود اقبال کے فکر کی اہمیّت کیا ہے کہ اس کی تنظیم اور تشریح اور تفہیم ضروری سمجھی جائے ہم شاید اس سوال کو نظرانداز کر دیتے لیکن حکمت اقبال کی منظم تشریح کے لیے اس سوال کا اُٹھانا اور اس کا جواب دینا ضروری ہے۔

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے وہ برابر اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جس کائنات میں وہ آنکلا ہے اس کی حقیقت معلوم کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک اس کائنات کی حقیقت معلوم نہ ہو وہ جان نہیں سکتا کہ خود اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور کائنات کے ساتھ اس کا تعلّق کیا ہے۔ کائنات کی حقیقت سے اُسے اپنی حقیقت کا سُراغ ملتا ہے کیونکہ وہ خود بھی کائنات کا ایک اہم جزو ہے اور اپنی حقیقت وہ اس لیے جاننا چاہتا ہے تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اسے اپنی زندگی کا استعمال کس طرح کرنا چاہیے۔ اس کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے اور وہ اپنی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر کس طرح سے کرے کہ اس سے اپنے لیے اسی دنیا میں یا اگلی دنیا میں (اگر وہ بھی ہو تو) بہترین قسم کے نتائج اور ثمرات حاصل کر سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ کائنات کے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلّی بخش جواب حاصل کر لے گا تو اسی جواب میں اسے اپنے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلّی بخش جواب بھی مل جائے گا اور پھر وہ اس جواب کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کا صحیح حل معلوم کر سکے گا اور اپنی زندگی کا استعمال صحیح طریق سے کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کا جو تصوّر بھی وہ قائم کرتا ہے وہ اپنی عملی زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کے مطابق بناتا ہے گویا اس کے لیے حقیقت کائنات کی تلاش نہ تو کوئی تفریحی مشغلہ ہے اور نہ ہی کوئی علمی یا نظری مسئلہ بلکہ ایک شدید عملی ضرورت ہے جس کی اچھی یا بُری تشفی اس کی روزمرہ کی زندگی کے تمام حالات اور اس کی تمام چھوٹی اور بڑی تفصیلات کو معین کرتی ہے بدنی ضروریات کی تشفی کو تو ہم ایک عرصہ تک التوا میں بھی ڈال سکتے ہیں لیکن اگر ہم اس ذہنی اور عملی ضرورت

کو ایک لمحہ کے لیے بھی ملتوی کر دیں تو ہمارا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اور ہم جنون، ہسٹیریا، خوف، غم، پریشانی ایسے ذہنی امراض کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ حکمتِ اقبال کی اہمیت اسی بنا پر ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ وہی حکمت ہے جو انسان کی شدید ذہنی اور عملی ضرورت کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

حکمت کی عمومیّت

یہ کہنا غلط ہے کہ حقیقتِ کائنات کے تصوّرات یا نظریات حکما یا فلاسفہ سے مخصوص ہوتے ہیں۔ در اصل انسان کی اس طرح سے بنی ہے کہ آج تک کوئی تندرست فرد عالم یا جاہل ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے جو حقیقتِ کائنات کا کوئی اچھا یا برا، صحیح یا غلط مختصر یا مفصّل منظم یا غیر منظم، عالمانہ یا جاہلانہ تصوّر نہ رکھے اور اپنی ساری عملی زندگی کو اس کے مطابق نہ بنائے۔ حکما یا فلاسفہ صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اور لوگوں کی نسبت زیادہ ذہین اور زیادہ باریک بین ہوتے ہیں اور اپنے ذوق اور اپنی افتادِ طبیعت کے لحاظ سے حقیقتِ کائنات کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے اور اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے زیادہ موزوں اور مستعد ہوتے ہیں جس طرح سے بعض افرادِ عام لوگوں کے لیے غلہ پیدا کرنے یا کپڑا بننے یا اور بدنی ضروریات کی چیزیں تیار کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے نوعِ بشر کے حکما اور فلاسفہ عام لوگوں کی سب سے بڑی ضرورت کی چیز یعنی حقیقتِ کائنات کا صحیح تصوّر جو ہماری ذہنی اور روحانی سطح کی ضروریات سے تعلّق رکھتا ہے بہم پہنچانے میں لگے رہتے ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حقیقتِ کائنات کے متعلق خود ان کا اور دوسرے لوگوں کا تصوّر زیادہ سے زیادہ صحیح ہو تاکہ وہ خود اور دوسرے لوگ اپنی عملی زندگی کو زیادہ سے زیادہ صحیح بنا سکیں لیکن حقیقتِ کائنات کے تصوّر کی ضرورت ہر انسان کے لیے اس قدر شدید اور فوری اور ناقابلِ التوا ہوتی ہے کہ لوگ کبھی فلسفیوں اور حکیموں کی تحقیق اور تجسّس کے ایسے نتائج کا انتظار نہیں کرتے جو آئندہ کسی وقت دستیاب ہونے والے ہوں بلکہ جو نظریات پہلے ہی موجود ہوتے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ قبول کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دیتے ہیں اور وہی نظریہ اپنی اولادوں کو وراثت میں سونپ جاتے ہیں لیکن اگر بعد میں آنے والی نسلیں کسی اور

نظریہ سے جو کسی اور حکیم یا فلسفی نے پیش کیا ہو متاثر ہو جائیں تو اپنے نظریہ کو بدل لیتی ہیں اور پھر ان کی ساری انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے مطابق بدل جاتی ہے تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات اسی طرح داناؤں، فلسفیوں اور حکیموں کے نظریات سے پیدا ہوئے ہیں۔

وحدتِ کائنات

حکما اور فلاسفہ ہر دَور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے جو بعد میں آتے ہیں، اپنے متقدمین کے فکر کی غلطیاں نکالنے اور دُرست کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے ان کے اختلافات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اگرچہ فلسفیوں اور حکیموں کا پُورا گروہ ابھی تک حقیقتِ کائنات کا صحیح تصور پیش کرنے سے قاصر رہا ہے تاہم جب سے اس گروہ نے حقیقتِ کائنات پر غور و خوض شروع کیا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک ایک پُراسرار وجدانی شہادت کی بنا پر اس بات کا پختہ یقین ان پر غالب رہا ہے کہ کائنات ایک یکساں کُل یا وحدت ہے یعنی وہ فاصلہ اور وقت دونوں کے اعتبار سے ایسے منطقوں یا حصّوں میں بٹی ہوئی نہیں جن میں متضاد قسم کے قوانینِ قدرت جاری ہوں۔ کائنات کے قوانین مسلسل اور مستقل ہیں۔ وہ نہ صرف ہر جگہ پر ایک ہی رہتے ہیں بلکہ ہر زمانہ میں بھی ایک ہی رہتے ہیں۔ وحدتِ عالم کا یہ وجدانی اعتقاد تمام بڑے بڑے حکیموں، فلسفیوں اور سائنسدانوں کے فکر میں خواہ وہ تصوریّت پرست ہوں یا مادیّت پرست، ایک قدرِ مشترک کا حکم رکھتا ہے۔ اگرچہ کوئی بڑا فلسفی یا سائنسدان اس کی صحت کی دلیل طلب نہیں کرتا بلکہ آغاز ہی سے اسے اپنے مسلّمات میں شمار کرتا ہے تاہم اس کی صحت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ وہ آج تک غلط ثابت نہیں ہو سکا۔ سائنس اور فلسفہ کی تمام ترقیات جو اب تک وجود میں آئی ہیں، ان کی بنیاد یہی حقیقت ہے اور وہ سب مل کر اس کی صحت کی شہادت دیتی ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر جویانِ حق و صداقت اور طالبانِ علم و حقیقت اس عقیدہ سے آغاز نہ کرتے اور یہ عقیدہ صحیح نہ ہوتا کہ کائنات ایک وحدت ہے اور اس کی تعمیر کے اندر ایک تسلسل موجود ہے جو کہیں نہیں ٹوٹتا تو سائنس اور فلسفہ دونوں ممکن نہ ہوتے یہی وہ عقیدہ ہے جو سائنسدان اور فلسفی دونوں کو اپنے اپنے دائرہ میں علمی تحقیق کے لیے اُکساتا ہے اور اسی کی تصدیق سے وہ اپنی علمی تحقیق کے نتائج پر مطمئن ہوتے اور اس کی راہ پر قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر فلسفی

یا سائنسدان کو معلوم ہو جائے کہ جو علمی حقیقت اس نے دریافت کی ہے وہ محض وقتی اور مقامی ہے اور اس کی متبادل یا متوازی علمی حقیقتیں اس کائنات میں اور بہت سی ہیں یا آئندہ ہو سکتی ہیں (مثلاً یہ کہ پانی ایک ہی مقام پر کبھی ایک درجۂ حرارت پر اُبلتا ہے اور کبھی دوسرے پر یا سطحِ سمندر سے ایک ہی بلندی پر کہیں ایک درجۂ حرارت پر اُبلتا ہے کہیں دوسرے پر) تو وہ اپنی تحقیق کے اس نتیجہ کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیگا۔ مذہبی رجحان رکھنے والے ایک انسان کے لیے تو وحدتِ عالم کا نتیجہ ناگزیر ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہے اور اسی کا مقصد پوری کائنات میں کارفرما ہے۔ اسی طرح سے ایک تصوریّت پرست فلسفی کا حکیمانہ زاویۂ نگاہ بھی اس عقیدہ کا تقاضا کرتا ہے لیکن یہ بات فطرتِ انسانی کے نہایت ہی اہم سربستہ رموز کو منکشف کرنے والی ہے کہ کارل مارکس اور اس جیسے دوسرے حکمائے مادیین بھی اس عقیدہ سے پہلوتہی نہیں کر سکے۔

وحدتِ کائنات کے مضمرات

وحدتِ کائنات کا مسئلہ ہمیں کئی نتائج کی طرف راہ نمائی کرتا ہے:۔

اوّل: کسی کثرت کے اندر وحدت کا ہونا نظم کے بغیر ممکن نہیں اور نظم ایک مرکزی اصول کے بغیر محال ہے۔ لہٰذا کوئی تصور ایسا ہونا چاہیے جو کائنات کی وحدت کا اصول ہو جو ایک ایسے رشتہ کی طرح ہو جو کائنات کی کثرت کو پرو کر ایک وحدت بناتا ہو۔

دوم: کائنات کی وحدت کے اصول کو کائنات کی آخری اور بنیادی حقیقت ہونا چاہیے اور باقی تمام حقائقِ عالم کو اس کے مظاہر۔ کیونکہ اگر وہ اس حقیقت کے مظاہر نہ ہوں تو وہ ان میں اتحاد اور نظم پیدا نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ حقائق اپنی فطرت کے اختلافات کی وجہ سے اس قابل رہتے ہیں کہ ان میں اتحاد اور نظم پیدا کیا جا سکے۔

سوم: کائنات کی وحدت بطور وحدت کے عقلی طور پر سمجھ میں آنی چاہیے لہٰذا ضروری ہے کہ تمام حقائقِ عالم کائنات کی بنیادی حقیقت کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ عقلی طور پر وابستہ ہوں اور اس باہمی وابستگی کے سبب سے ایک ایسی زنجیر کی صورت اختیار کریں جس کا پہلا اور آخری حلقہ کائنات کی وہی بنیادی حقیقت ہو اور جس کے تمام حلقے ایسے ہوں کہ ہر حلقہ اگلے حلقے کی

طرف راہ نمائی کر رہا ہو جبکہ حقائق عالم کی ایسی ہی زنجیر کو نظامِ حکمت (PHILOSOPHICAL SYSTEM) کا نام دیتے ہیں۔

چہارم: اگر ہم حقائق عالم میں سے کسی حقیقت کی علت بیان کریں تو وہ علت اس حقیقت کی تشریح تو کر دیتی ہے لیکن خود کئی سوالات پیدا کر دیتی ہے اور پھر ان سوالات کا جواب اور سوالات پیدا کرتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر کائنات کو ایک وحدت مانا جائے تو ضروری ہے کہ ان پےَ در پےَ پیدا ہونے والے سوالات کا آخری جواب اور ہر حقیقت کی آخری تشریح کائنات کی وہی حقیقت ہو جو حقیقت الحقائق ہے۔

پنجم: اصولِ وحدتِ کائنات یا حقیقتِ کائنات کے ہزاروں تصوّرات ممکن ہیں لیکن ان میں صحیح تصوّر صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو کائنات کی وحدت ختم ہو جاتی ہے اور ضروری ہے کہ کائنات کے تمام صحیح اور سچّے حقائق صرف اسی ایک تصوّر کے ساتھ علمی اور عقلی مطابقت رکھتے ہوں اور کسی دوسرے غلط تصوّر کے ساتھ مطابقت نہ کر سکیں اور جب کائنات کا صحیح نظامِ حکمت وجُود میں آئے تو اس کا مرکزی اور بنیادی نقطہ یہی تصوّرِ حقیقت ہو۔ اگر کوئی ایک سچّی حقیقت بھی ایسی ہو جو کسی نظامِ حکمت کے ساتھ مطابقت نہ رکھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نظامِ حکمت کسی غلط تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہے اور اگر کوئی علمی حقیقت جسے علمی حقیقت سمجھا جا رہا ہے کسی صحیح نظامِ حکمت کے ساتھ جو صحیح تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہو مطابقت نہ رکھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ علمی حقیقت علم کے معرُوف اور مسلّم معیاروں پر پُوری نہ اُتر سکے گی۔ غلط تصوّرات صحیح نظامِ حکمت کے اندر نہیں سما سکتے اور صحیح تصوّرات غلط نظامِ حکمت کے اندر داخل ہو کر اپنی اصلی حالت پر نہیں رہتے۔ لیکن صحیح نظامِ حکمت ہر دور میں تمام صحیح تصوّرات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے اور یہی اس کی صحت کا قابلِ اعتماد معیار ہوتا ہے۔

ششم: وحدتِ کائنات کا مطلب یہ ہے کہ حقائق عالم ایک عقلی ترتیب اور تنظیم اختیار کر سکتے ہیں۔ حقائق عالم کی عقلی ترتیب اور تنظیم ہمارے معلوم اور نامعلوم حقائق کے درمیان ایک رابطہ یا کشش پیدا کرتی ہے اور ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم معلوم حقائق کی مدد سے نامعلوم حقائق

کو ہم دریافت کرتے چلے جائیں یہاں تک کہ حقائق عالم کے سلسلہ کی ساری کڑیاں اپنی اصلی عقلی ترتیب کے ساتھ ہمارے احاطۂ علم میں آجائیں۔ سائنسدان اور فلسفی دونوں اس کام کو انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی کوششوں سے معلوم حقائق کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے جوں جوں ان کی تعداد زیادہ ہوتی چلی جائے گی صحیح اور سچے تصورِ حقیقت کے ساتھ ان کے مجموعے کی علمی اور عقلی مناسبت بڑھتی چلی جائے گی اور ہر غلط تصورِ حقیقت کے ساتھ کم ہوتی جائے گی اور ہم اپنے وجدان کی شہادت کی بنا پر زیادہ آسانی کے ساتھ بتا سکیں گے کہ حقیقتِ کائنات کا کون سا ایسا تصور ہے جو ان حقائق کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور کون سا ایسا ہے جو مناسبت نہیں رکھتا اور اس طرح سے ہم صحیح تصورِ حقیقت اور اس پر قائم ہونے والے صحیح نظامِ حکمت کے قریب آتے جائیں گے

ہفتم: صحیح نظامِ حکمت جب وجود میں آئے گا تو ابتدا میں لازماً مختصر ہوگا اور پھر جوں جوں معلوم حقائق کی تعداد بڑھتی جائے گی اور وہ اس کے اندر سماتے جائیں گے تو وہ کامل سے کامل تر ہوتا جائے گا اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ کیونکہ حقائق علمی کی کوئی حد نہیں نئے دریافت ہونے والے حقائق علمی کی تائید اور توثیق کی وجہ سے یہ نظامِ حکمت روز بروز مفصل اور منظم اور معقول ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے غلط نظام ہائے حکمت دن بدن اپنی معقولیت کھوتے جائیں گے حتیٰ کہ دنیا بھر میں یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ یہی نظامِ حکمت ہے جو ہر لحاظ سے درست اور تسلی بخش ہے اس نظامِ حکمت کے وجود میں آنے کے بعد ہر علمی ترقی خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے تعلق رکھتی ہو یا تو اس کی تائید کرے گی یا پھر وہ کوئی علمی ترقی ثابت نہ ہوگی

وحدتِ کائنات کے اعتقاد کا سرچشمہ

وحدتِ کائنات پر انسان کے غیر شعوری وجدانی اعتقاد کا سرچشمہ دراصل اس کی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ کائنات کا کوئی ایسا خالق مانے جو ایک ہی ہو اور انسان کی فطرت کا یہ تقاضا بے معنی نہیں۔ فطرتی تقاضوں کو پوری طرح سے مطمئن کرنے کا سامان قدرت کے اندر پہلے ہی موجود ہوتا ہے چونکہ کائنات سائنسدانوں اور فلسفیوں کی آج تک کی تحقیق سے ایک وحدت ثابت ہوتی ہے لہٰذا

اس کے اندر کوئی اصُول کارفرما ہے جو اس کو ایک وحدت بناتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ یہ اصُول خدا ہے جو کائنات کا خالق ہے جو ایک ہی ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآنِ حکیم نے کائنات کی وحدت کی طرف پُرزور الفاظ میں توجہ دلائی ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔

ماترٰی فی خلق الرحمٰن من تفٰوت ط فارجع البصر ھل ترٰی من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسئًا و ھو حسیر ہ

آپ خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی ناہمواری نہ دیکھیں گے۔ ذرا نظر دوڑایئے (اور کائنات کا مشاہدہ کیجئے) کیا آپ کو خدا کی اس تخلیق میں کہیں کوئی بے ربطی نظر آتی ہے۔ پھر دوبارہ نظر دوڑایئے اور دیکھئے نگاہیں اس بات سے ناکام ہوکر آپ کی طرف لوٹیں گی کہ خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی ناہمواری پا سکیں۔

قل ارایتم ماتدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرك فی السمٰوٰت۔

اے پیغمبر (ان لوگوں سے) کہیے کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر کس سے حاجتیں طلب کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین میں کون سی چیز پیدا کی ہے۔ یا کیا آسمانوں کی تخلیق میں ہی ان کا کوئی حصّہ ہے ؟

یعنی اگر کائنات کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کوئی اور شریک ہوتا تو زمین و آسمان میں کہیں تو اس کی اپنی تخلیق کا نشان ملتا جہاں جُدا قسم کے قوانین قدرت نافذ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ منکرین قرآنِ حکیم کے اس سوال کے جواب میں اسی کائنات کا ایک حصّہ پیش کر کے معقولیّت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صاحب! یہ ہے کائنات کا وہ حصّہ جو خدا کے اس شریک نے پیدا کیا ہے جسے ہم مانتے ہیں کیوں کہ جب کائنات کے اس حصّہ میں بھی قوانین قدرت وہی ہوں جو باقی کائنات میں ہیں تو کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا خالق وہی نہیں جو باقی کائنات کا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ وحدتِ کائنات کی حقیقت کو وحدت خالق کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا۔

اسے پیغمبر (ان لوگوں سے) کہئے کہ اگر زمین میں خدا کے سوائے اور بھی خدا ہوتے تو دونوں (یعنی زمین اور آسمان) میں بدنظمی رونما ہو جاتی۔

یعنی چونکہ زمین اور آسمان میں کہیں بھی دوعملی، بدنظمی یا تضاد موجود نہیں اور تم اس بدنظمی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ وحدتِ کائنات اور تسلسلِ قوانینِ قدرت کو خود بخود اپنے مسلمات میں شمار کرتے ہو تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ کائنات کا خالق بھی ایک ہی ہے۔ چونکہ قوانینِ قدرت کے تسلسل کا مسئلہ وحدتِ کائنات کی دلیل ہے اور وحدتِ کائنات وحدتِ خالق کی دلیل ہے اور چونکہ قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانینِ قدرت کے مطابق بنائے لہٰذا انسان کو یقین دلانے کے لیے کہ یہ قوانین قابلِ اعتماد ہیں، قرآنِ حکیم بار بار ان کے تسلسل اور استقلال کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً

(اسے پیغمبر) آپ خدا کے قوانین میں کہیں اور کبھی کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

لن تجد لسنۃ اللہ تحویلاً

آپ خدا کے قوانین میں کہیں اور کبھی کوئی تغیّر نہ پائیں گے۔

دُوسرے فلسفیوں کی طرح اقبال بھی کائنات کو اس کی رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوجود ایک وحدت قرار دیتا ہے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
کمال بے بصری قصۂ قدیم و جدید

یہی وجہ ہے کہ اقبال کا فلسفہ دوسرے فلسفیوں کی طرح ایک نظامِ حکمت ہے لیکن اقبال میں اور دوسرے فلسفیوں میں فرق یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کائنات کی وحدت کا اصُول یا حقیقتِ کائنات جو کائنات کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کرتی ہے حق تعالیٰ کا وجُود ہے۔ ان صفات کے ساتھ جو خاتم الانبیاءؐ کی تعلیم میں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں اور دوسرے فلسفیوں میں سے ہر ایک حقیقتِ کائنات کا جو تصوّر قائم کیے ہوئے ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ خدا کی فطرت وہ اصُول ہے جو پُوری کائنات کو متحد کرتا ہے۔ لہٰذا خدا کے عاشق کے دل میں پُوری کائنات سما جاتی ہے۔ انسانی انا ایک ہے لیکن اس کے خارجی اثرات بہت سے ہوتے ہیں وہ مخفی ہے لیکن اس کے

باقی صـ۶۶ـ پر